دیتے ہیں۔ اس طرح ہم دو دفعہ متاثر ہوتے ہیں۔

اداروں کا زوال

جیو نیلی وژن کے پروگرام، پچاس منٹ، میں ایک انتہائی اہم موضوع پر مذاکرہ منعقد کیا گیا، موضوع یہ تھا کہ پاکستان میں قومی ادارے زوال پذیر کیوں ہیں؟ حقیقت حال سے واضح ہے کہ تمام ادارے زوال پذیر ہیں، لیکن اس عمل کو کامیابی کے ساتھ روکنے کے لئے اسکی حقیقی وجوہات کا پتہ لگانا ضروری ہے۔

مذاکرہ میں مختلف وجوہات بیان کی گئیں اور یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان میں ادارے بن ہی نہیں سکے۔ لیکن یہ بات حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی، جن اداروں کی بات کی جاتی ہے وہ انگریز کے دور میں ہی اس خطے میں قائم ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے پر یہی ادارے اس ملک میں قائم کر دیئے گئے اور قیام پاکستان کی پہلی دہائی میں یہ ترقی پذیر بھی رہے اور بہت حد تک کامیابی کے ساتھ کام بھی کرتے رہے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں جو لوگ با اختیار تھے انہوں نے قیام پاکستان کی تحریک بھی دیکھی تھی اور وہ قومی جذبہ سے سرشار اور اخلاقی قدروں کا لحاظ رکھنے والے لوگ تھے۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ دائرہ عمل سے خارج ہوتے گئے اور پہلے مارشل لاء کے بعد دوسرے لوگوں نے انکی جگہ لے لی اور بعد میں آنے والے لوگوں کی اخلاقی قدریں مختلف تھیں۔ یہیں سے پاکستانی معاشرت کا رنگ اور انداز بدل گیا۔ زمام اختیار اب ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں رہی جو قومی جذبے اور اخلاقی قدروں سے لیس تھے۔

بنیادی طور پر پاکستانی معاشرہ قبائلی قدروں اور فیوڈل نظام پر مشتمل ہے۔ قبائلی اور فیوڈل معاشرے کی سب سے بڑی اور اہم قدر طاقت کی پرستش ہوتی ہے۔ طاقتور کی خوشی اور فرماں برداری ہی اس معاشرے کی بنیادی قدر ہوتی ہے۔ باقی قدریں اسی اصول پر بنتی ہیں۔ پاکستانی قومیتوں کا یہی مزاج ملک میں بار بار مارشل لاء لگنے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ مارشل لاء فوج کی حکمرانی ہے اور فوج طاقت کا سمبل ہے۔ یہاں جب بھی کوئی جنرل مارشل لاء لگاتا ہے تو معاشرے کا ایک بڑا حصہ اس کا استقبال کرتا ہے اور اپنی خدمات اسے پیش کرتا ہے اور یہ عام سوجھ بوجھ کی بات ہے کہ جس کا استقبال کیا جائے، وہ بار بار آئے گا۔ ہمارے معاشرے کی اس خصوصیت کو دیکھ کر بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ہمیشہ بار بار مارشل لاء لگتے رہیں گے اور کوئی قوت اس کو روک نہیں سکتی۔ مارشل لاء سے نجات کا صرف ایک ہی ذریعہ

ہے کہ قوم کا مزاج بدلا جائے تو طاقت کی پوجا کے بجائے دوسری اعلیٰ اور معروف قدروں کو قومی مزاج کا حصہ بنایا جائے ہندوستان اور دوسری مہذب قوموں اور ملکوں میں مارشل لاء نہ لگنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہاں کی فوج کمزور ہے وہاں مارشل لاء اس لئے نہیں لگتا کیوں کہ وہاں جنرلوں کو یہ معلوم ہے کہ قوم ان کا استقبال نہیں کرے گی۔ ورنہ مارشل لاء لگانے کے لئے پوری فوج کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

قومی اداروں کے زوال کی دو اصل اور بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک اخلاقی قدروں کا بحران اور دوسرے سوچ کا فقدان کسی بھی قسم کے قانون کی پابندی ہمارا انفرادی اور قومی مزاج نہیں ہے۔ بڑے بڑے قومی اداروں میں بیٹھے ہوئے لوگ اس معاملہ میں حساس نہیں ہیں کہ ہر حال میں قانون کی پابندی ہونی چاہیے۔ وہ صرف اس حد تک قانون کی پابندی کے قائل ہوتے ہیں جب تک انکا مفاد متاثر نہ ہو اور جب تک کسی صاحب قوت و اختیار کی ناراضگی کا احتمال نہ ہو یہی وجہ ہے قومی اداروں پر سے عام آدمی کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ دوسرے ممالک میں بھی لوگ انفرادی طور پر جھوٹ بولتے ہونگے لیکن ہمارے یہاں قومی ادارے بھی صاف جھوٹ بولتے ہیں جس کی وجہ سے کسی بھی ادارے کی کریڈیبلٹی باقی نہیں رہی۔ نہ ہم سچ بولتے ہیں اور قانون کی پابندی کو اپنے مفاد سے بالاتر سمجھتے ہیں بلکہ قانون کی خلاف ورزی کو اعلیٰ حیثیت کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ ادارے انسانوں کے لئے بنتے ہیں اور جیسے اعتقادات اور اہلیت کے لوگ یہ ادارے چلاتے ہیں اسی پر ان اداروں کی ترقی، استحکام یا زوال کا انحصار ہوتا ہے۔ اداروں کے حوالے سے 'میرٹ' (Merit) انتہائی اہم اور اعلیٰ قدر ہوتی ہے خاص طور سے ان عہدوں کے لئے جو صاحب اختیار ہوتے ہیں۔ یہ اب عام طور مشاہدے کی بات ہے کہ اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے لئے اہلیت کے بجائے اور بہت سی چیزوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ آج کے حالات کا اگر غور سے اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو یہاں Misfits کی دنیا نظر آئے گی۔ چند استثناء ضرور دیکھے جا سکتے ہیں۔

اداروں کے زوال کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہماری تمام عقل، نقل کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ بغیر مناسب غور و فکر کے ہم دوسروں کے طور طریقے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جو بجائے فائدے کے نقصان کا سبب بنتے ہیں۔ اسکے علاوہ بھی جو بھی تبدیلی بہتری کے لئے کی جاتی ہے وہ بدتری کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ عمل اداروں کی خرابی کا باعث بنتا ہے۔

اس ملک میں جب بھی کسی شعبہ میں اصلاحات کی گئی ہیں وہ متعلقہ ادارہ کی بدتری اور زوال کا باعث بنی ہیں اسکی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں تعلیمی اصلاحات کی گئیں اور ڈگری کورس

کو دو سال کے بجائے تین سال کا کر دیا گیا۔ اسکا کچھ مقصد واضح نہ تھا اور یہ کامیاب نہیں ہوا اور تیسرے سال سے پہلے ہی اسکا دورانیہ دوبارہ دو سال کا کرنا پڑا۔ اسکے علاوہ بھی ان اصلاحات سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ تعلیم کا معیار گر گیا۔ ان ہی اصلاحات کے ذریعہ ایک نظام قائم کیا گیا جس کی رو سے امتحان کے کچھ مارکس اساتذہ طلباء کی کورس کے دوران کارکردگی پر دیتے تھے۔ اس سے صرف یہ ہوا کہ طلباء میں خوشامد کی بیماری پھیل گئی زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لئے وہ زیادہ سے زیادہ استادوں کی خوشامد کے طریقے ڈھونڈنے لگے۔

۱۹۷۶ء میں فوجداری قانون میں اصلاحات کی گئیں اور سیشن کیسوں کا طریقہ کار بدل دیا گیا Committal Enquiry کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ مجسٹریٹ ایسے کیسوں میں انکوائری کرنے کے بعد سیشن کورٹ کو بھیجتا تھا اور جب اس کیس کا نمبر آتا تھا تو وہ مجسٹریٹ یہ انتظام کرتا تھا کہ تمام گواہ سیشن کورٹ میں حاضر ہوں اور سیشن کیس تین یا چار دن میں مکمل ہو جاتا تھا۔ فیصلہ تین چار دن میں ہو جاتا تھا۔ اس طریقہ کار کی وجہ سے سیشن کورٹ کی اتنی اہمیت تھی کہ اس کے نوٹس پر تمام گواہ پیش کر دیئے جاتے تھے۔ اصلاحات کے بعد یہ حال ہو گیا کہ سیشن کورٹ کے وارنٹ کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی اور ان کیسوں کے فیصلہ میں پہلے سے بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ اب سیشن کورٹ کی اہمیت اس زمانے کے مجسٹریٹ جیسی بھی نہیں رہی۔

دفتری کاروائی سے متعلق اصلاحات ۱۹۶۰ء میں کی گئیں جب Section Officers Scheme نافذ کی گئی اسکا مقصد کاروائی کے مرحلوں کو کم کرنا تھا۔ اس سے پہلے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس اسکیم کے ذریعے تین مرحلے مقرر کئے گئے اس کے مطابق کسی بھی معاملہ کی ابتداء سیکشن افسر کے نوٹ سے ہوتی تھی۔ دوسرا مرحلہ ڈپٹی سیکریٹری اور تیسرا آخری سیکریٹری تھا۔ اس اسکیم کا نہ تو کوئی فائدہ ہوا اور نہ یہ اپنی اصلی حالت میں قائم رہ سکی، کیونکہ ہر ڈپٹی سیکریٹری ترقی کر کے سیکریٹری نہیں بن سکتا تھا اس لئے کچھ عرصہ بعد جوائنٹ سیکریٹری کا عہدہ بحال کر دیا گیا۔ پھر جب اس سے بھی کام نہ چلا تو ایڈیشنل سیکریٹری کا عہدہ بھی بحال کر دیا گیا۔

سب سے بڑا نقصان اس اسکیم کا صلاحیت کے معاملہ میں ہوا۔ اس اسکیم سے پہلے نوٹنگ اور ڈرافٹنگ کا کام کلرک کا ہوتا تھا جو وہ نہایت کامیابی سے کر رہے تھے ان دنوں کسی کلرک کے لئے یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ وہ نوٹ نہیں لکھ سکتا یا ڈرافٹ نہیں بنا سکتا اس اسکیم کے نفاذ کے وقت جب یہ بات معلوم ہوئی کہ اب کسی بھی کیس میں پہلا نوٹ سیکشن آفیسر لکھے گا، جو کہ اس افسر ہوگا تو کلرک حیران تھے۔ اس اسکیم

نے صلاحیت کے معیار میں کمی اور افسران کی عزت میں کمی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ میں نے ایسے ۲۰ گریڈ اور ۲۱ گریڈ کے افسران دیکھے ہیں جو ایک مناسب نوٹ نہیں لکھ سکتے جیسا کہ پہلے کلرک لکھ لیا کرتے تھے۔

ان تمام معاملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصلاحات کرنے والوں کی سوجھ بوجھ ان نتائج کا اندازہ کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے مذہبی پیشواؤں نے ہمیں عقل کو نقل تک محدود کرنے کا سبق دیا پھر غلامی کے زمانے میں آقاؤں نے ہماری سوچ پر پابندیاں لگا دیں۔ اب ہماری عقل کا کام صرف ان چیزوں کو تلاش کرنے اور اپنانے تک محدود ہو گیا جو پہلے سے کہیں نہ کہیں موجود ہیں ایسی قوم کے ادارے زوال پذیر نہ ہونگے تو اور کیا ہوگا؟

﴿الشریعہ اکادمی کی تازہ مطبوعات﴾

جناب جاوید احمد غامدی کے حلقۂ فکر کے ساتھ

ایک علمی وفکری مکالمہ

از قلم: ابوعمار زاہد الراشدی / معز امجد / خورشید ندیم / ڈاکٹر فاروق خان

صفحات: ۲۰۰ ۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

حدود آرڈیننس اور تحفظ نسواں بل

از قلم: ابوعمار زاہد الراشدی

صفحات: ۱۵۲ ۔ قیمت: ۱۲۰ روپے

○

ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ

تقسیم کنندہ: دار الکتاب، غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

وفیات

ہے رشک اک جہان کو "سرور" کی موت پر

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

شعبہ ابلاغ عامہ جامعہ کراچی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر، سرور نسیم کی یاد میں

جامعہ کراچی کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ میرے مرحوم دوست سرور نسیم کا تھا۔ جن کا ۱۶ فروری ۲۰۰۷ء کو اچانک انتقال ہوا۔ اس سانحہ پر جامعہ کی فضا سوگوار اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اتنی کثرت اور ایسا اژدھام اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آیا۔ مرحوم اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال میں تھے۔ بظاہر ہشاش بشاش، تندرست وتوانا اور صحت مند دکھائی دیتے تھے سوائے اس کے کہ گذشتہ کئی ماہ سے بلڈ پریشر کی شکایت بتاتے تھے۔ اور اسکے لئے وہ خاصے فکرمند بھی تھے۔

مرحوم سے میری دوستی کا رشتہ اس وقت قائم ہوا۔ جب میں پروفیسر ڈاکٹر محمد قیصر کی اسٹوڈنٹ ایڈوائزری ٹیم میں بطور اسسٹنٹ شامل ہوا۔ مرحوم اس ٹیم میں بہت پہلے سے شامل تھے۔ اس طرح تقریباً روزانہ ہی کبھی کم اور کبھی زیادہ وقتوں کی ملاقاتیں رہنے لگی تھیں۔ انکی خوش مزاجی میں سنجیدگی کی ملونی تھی۔ وہ طلبہ تنظیموں کو شفقت ومحبت سے ڈیل کرنے کے قائل تھے۔ طبیعت میں صلح پسندی کا جوہر بھی مبداء فیاض سے ودیعت ہوا تھا۔ حقدار کو حق دلانے میں پیش پیش رہتے تھے اور اگر کسی کا حق مارا جاتا تو مضطرب ہو جاتے تھے۔ تقریباً دو سال تک ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس عرصہ میں میں نے انہیں بلا مبالغہ ایک با اخلاق، با اصول اور شریف النفس انسان پایا۔ ان کے سانحہ ارتحال پر انکی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ان کے متعدد دوستوں نے جو اظہار خیال کیا ہے۔ وہ اظہار واقعی ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شرافت ودیانت اور

اصول پسندی کا دورانیہ فقط دو ایک سالوں پر نہیں بلکہ انکی پوری زندگی پر مستولی تھا۔

ان کی وفات سے ایک ہفتہ قبل ان سے میری آخری اور یادگار ملاقات ہوئی تھی۔ میں ان سے ملنے ان کے دفتر گیا تھا۔ اس ملاقات کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس بار انہوں نے قدرے غیر معمولی انداز میں میرا استقبال کیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس ملاقات میں تین مرتبہ ایسا ہوا کہ جب بھی میں نے ان سے رخصت چاہی، انہوں نے اٹھنے نہ دیا بلکہ ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت بے تکلفی سے کہا دکتور! بیٹھے رہو کہاں جاؤ گے؟ میں نے کہا گھر۔ کہنے لگے، گھر جا کر کیا کرو گے؟ تھوڑا وقت ہمیں بھی دے دیا کرو اور میں ان کے کہنے پر تینوں مرتبہ بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں انہوں نے چائے کا بھی پوچھا مگر میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ اس لیے چائے نہیں پیوں گا۔ مگر شاید وہ خود پینا چاہتے تھے اس لیے منگوالی اور اس دوران میں بھی ان کی اجازت سے گھر آ گیا۔ ملاقات میں پتہ چلا تھا کہ اگلے دن انہیں اسلام آباد جانا ہے۔ اور جامعہ میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار کے انتظامات بھی ان کے ذمہ ہیں یہ وہ سیمینار تھا، جو ان کی زندگی کا آخری سیمینار ثابت ہوا۔

ماہِ رمضان میں مرحوم جس انہماک اور خلوص سے مسجد میں نماز تراویح کے لئے آیا کرتے تھے وہ مناظر بھی قابل یاد ہیں۔ باالعموم عشاء کی اذان وہ گھر میں نہیں مسجد میں آ کر سنتے تھے۔ پھر پہلی صف میں بیٹھنے کا خصوصی اہتمام کرتے۔ ان کی یہ ادا میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مرحوم ایکدن میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے ایک فتویٰ لینا ہے کیا تم فتویٰ دے سکتے ہو؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور مسکرا کر پوچھا۔ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے؟ کہنے لگے وراثت کا مسئلہ ہے، میں نے کہا پوچھو! کہنے لگے میں لکھ کر پوچھوں گا۔ پھر اگلے روز وہ میرے پاس آئے اور استفتا میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ پھر تفصیلی جواب کے طالب ہوئے۔ یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ حمایت حق کی جو خوبی اس وقت میں نے ان کے اندر پائی وہ یہ تھی کہ وہ فقط خدا خوفی کے باعث شریعت اسلامیہ کے مطابق وراثت کی تقسیم چاہتے تھے، خواہ ان کے اپنے حصے میں کچھ آئے یا نہ آئے؟ اور یہ دراصل ان کے اپنے من کی وہ سچی پکار تھی، جو ان کا شعار بن چکی تھی۔ رزق حلال کمانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور وہ اکثر ایسی ہی باتیں کرتے نظر بھی آتے تھے۔ دوسروں کو ترغیب بھی وہ ایسی

ہی باتوں کی دیتے تھے۔ بظاہر تو وہ جوان تھے۔ مگر قدرت نے انہیں دماغ کسی "بزرگ ناصح" کا دیا تھا۔

وہ حد درجہ قابل اعتبار تھے اور رازوں کے امین۔ انجمن اساتذہ کے وہ صدر بھی رہے۔ اور جنرل سیکریٹری بھی اور موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ محمد قاسم رضا صدیقی کے میڈیا ایڈوائزر بھی اور اس کے علاوہ بھی متعدد عہدوں کے حامل رہے۔ اس عرصہ سیاست وخدمت میں ان کے پاس متعدد اساتذہ کی تحریری شکایتیں موصول ہوئیں مگر وہ کسی کو یہ نہیں بتاتے تھے کہ کس نے کس کی شکایت لکھ کر بھیجی ہے۔ الا یہ کہ خال خال۔ تاہم جسکے بارے میں شکایت ہوتی اسے بھی اور جو شاکی ہوتا اسے بھی سمجھانے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ اور نیک مشوروں سے نوازتے تھے۔ مرحوم نے پسماندگان میں بیوہ پانچ بیٹیاں اور ایک دو سالہ بیٹا یادگار چھوڑا ہے۔ اللہ ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔ (آمین)

موت سے کس کو رستگاری ہے؟
آج وہ کل ہماری باری ہے

عرب اور موالی
(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی)
ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر
صفحات: ۳۴۸
قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: قرطاس
پی او بکس 8453،
کراچی یونیورسٹی، کراچی

- نام کتاب: احادیث القرآن (قرآنی حدیثیں)
نام مصنف: ڈاکٹر ازھر ازھری
سن اشاعت: ۲۰۰۶ء
قیمت: ۱۲۰ روپے۔ صفحات: ۱۵۴
ناشر: ایس ایس ٹریڈرز انٹرنیشنل کراچی پی او بکس ۱۸۰۷۷
تبصرہ نگار: محمد اعظم سعیدی

ڈاکٹر ازھر ازھری کے نزدیک ذخیرہ احادیث چونکہ حضور اکرم ﷺ کے وصال سے تقریباً دو سو سال بعد جمع ہوا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سماعت کرنے والے صحابہ بھی بقید حیات نہ تھے کہ وہ اپنی ذات سے منسوب روایات کی تصدیق وتائید فرماتے اس لئے اس ذخیرہ کو احادیث کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس حوالے اس ان کی پہلی کتاب کا نام "قرآن وحدیث" ہے جس میں انہوں نے اپنے نقطہ نظر سے یہ ثابت کیا ہے کہ بخاری ومسلم سمیت جو کچھ حدیث کی کتابوں میں حدیث کے نام سے موجود ہے وہ سب سنی سنائی ناقابل اعتبار روایت ہیں اور ان کتب حدیث میں حدیث ایک بھی نہیں ہے۔

زیر نظر کتاب "احادیث القرآن" اسی سلسلے کی دوسری کتاب ہے جسکے تعارف میں احادیث رسول کے زیر سایہ احادیث قدسیہ پر بھی آلات سرجری استعمال کر کے سابقہ عنوان کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ احادیث رسول اور احادیث قدسی خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآن سے باہر مختلف کتب احادیث میں جو احادیث قدسی یا احادیث رسول کے نام سے معروف ومشہور ہیں وہ روایت پرست حضرات نے ادھر ادھر سے سن سنا کر اسے روایت کا نام دینے کے بجائے قرآن سے لفظ حدیث چرا کر اسے حدیث رسول اور حدیث قدسی کا نام دے دیا ہے۔ بعد ازاں حسب روایت وہی تنقید واعتراضات کا طومار کہ شیخ الحدیث کا عہدہ حاصل کر لیا قرآن کے ساتھ تو صحیح نہیں لکھا جاتا مگر بخاری ومسلم سے پہلے صحیح لکھا جاتا ہے حافظ قرآن کے مقابلے میں حافظ حدیث کی اصطلاح گھڑ لی گئی۔ محیر العقول اور غیر معمولی حافظہ عربوں کا تھا مگر صحاح ستہ کے مؤلفین ایرانی ہیں جیسے سطحی اور استہزائی اعتراضات ہیں جو صدیوں سے دہرائے جارہے ہیں اور بالا ستیعاب انکے جوابات بھی دیئے جارہے ہیں۔